اقبال اور علماء*

رشید احمد جالندھری

عہد جدید میں جمال الدین افغانی مسلم دنیا کی پہلی انقلابی شخصیت ھیں، جسے اسلام کے کلاسیکی علوم پر عبور تھا۔ وہ ان عوامل اور محرکات پر گہری نظر رکھتے تھے جو قوموں کے عروج و زوال یا تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتے ھیں۔ چنانچہ وہ تاریخ اور اپنی کلاسیکی روایات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ موجودہ وقت میں مسلم ریاستوں کی وحدت صرف کانفرڈریشن کی صورت ھی میں وجود میں آسکتی ھے، نیز یہ کہ قوموں کا سیاسی زوال، فکری انحطاط کے پہلو بہ پہلو چلتا ھے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ھے کہ وہ اپنی مذھبی اور فکری روایات کی پیروی کرتے ھوئے جدید علوم میں مہارت حاصل کریں کیونکہ افغانی کی نظر میں مشرق پر مغرب کا تسلط نام ھے جہالت پر علم کی حکمرانی کا۔ چنانچہ افغانی نے اپنے افکار کی نشرو اشاعت کے لئے مسلمانوں میں رائج نظام تعلیم پر سخت تنقید کی، کیونکہ یہ نظام تعلیم ان کی نظر میں وقت کا ساتھ نہیں دیتا اور اجتماعی زندگی کی مشکلات اور مسائل کو سمجھنے سے قاصر ھے، اس سلسلہ میں انھوں نے علماء پر بھی تنقید کی، کہ اب وہ اپنی روایات کے برعکس وقت کے تقاضوں سے یک قلم بے خبر ھیں، اور نئے علوم کی مخالفت کرکے اسلام کو نقصان پہنچا رھے ھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے جدید تعلیم کے داعیوں کا بھی سخت تعاقب کیا کہ وہ مغربی تہذیب اور جدید علوم کی تہ میں کام کرنے والے فلسفہ کا ادراک کئے بغیر

---

* یہ مقالہ لاھور میں بین الاقوامی اقبال کانگرس (دسمبر ۱۹۷۷) کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ دراصل مطالعہ افغانی و اقبال کا ایک حصہ ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ھو 'جمال الدین افغانی اور عرب رھنما، 'فکر و نظر، اگست ۱۹۷۷

مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ جس سے مسلم قوم کو خود اپنی فکری وراثت پر اعتماد نہیں رہے گا۔

افغانی کے ان افکار کی بازگشت تقریباً ساری مسلم دنیا میں سنی گئی، مصر میں شیخ عبدہ نے اپنی بساط کے مطابق ان پر کام کیا۔ چنانچہ آج علمی حلقوں میں افغانی اور عبدہ کے افکار و آراء سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ لیکن برصغیر کی فکری زندگی میں افغانی کے افکار کس حد تک مقبول تھے، یا یہاں ان کے کون جانشین تھے؟ اس امر پر ابھی تک بحث نہیں ہوئی۔ اردو میں ''آثار جمال الدین افغانی،، نامی پہلی کتاب کے علاوہ کوئی دوسری تحقیقی کتاب نہیں لکھی گئی، حالانکہ بیسویں صدی کے شروع میں بر صغیر کی فکری اور مذہبی زندگی پر جن دو ممتاز آدمیوں نے اثر ڈالا ہے، وہ دونوں (ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد) جمال الدین افغانی کے افکار سے متاثر تھے۔ دونوں نے کھل کر افغانی کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔

ہم یہاں آج کی محفل میں اپنی گفتگو ڈاکٹر محمد اقبال تک ہی محدود رکھیں گے اور وہ بھی اقبال اور علمائے کرام تک۔

افغانی علمائے کرام اور ان کے تعلیمی نقطۂ نظر سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے جدید علوم سے علماء کی بے اعتنائی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا :

کہ علماء نے آج کل علم کو دو انواع میں تقسیم کردیا ہے، ایک کو وہ اسلامی علم سے موسوم کرتے ہیں، اور دوسرے کو یورپی علم سے، اسی بنا پر وہ ایک مفید علم سے اکتساب کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ اس چیز کو قطعاً نہیں سمجھتے کہ علم جو ایک شرف انسانی ہے، کسی خاص گروہ یا قوم سے متعلق نہیں . . . . نئے علوم کو رد کرنے میں ان کی منطق یہ ہے کہ

اس طرح وہ اسلام کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھتے ھیں ۔(۱) افغانی نے اس سلسلہ میں مزید کہا : ھمارے آج کل کے فقہاء نہ صرف بند کواڑوں کے پیچھے لوگوں سے الگ تھلگ ھوجاتے ھیں، بلکہ یوں محسوس ھوتا ھے جیسے دنیاوی امورسلجھانے میں اپنی نااھلی پر وہ فخر کرتے ھوں ۔(۲) افغانی نے علماء کے بارے میں جو کچھ کہا، اقبال نے بھی تقریباً وھی کہا، وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ھیں :-

افسوس ! کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبع سے بالکل بے خبر ھیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ھیں ۔(۳) ایک دوسرے خط میں انھوں نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ تحریک خلافت نے علماء کے سیاسی اثر کو بحال کردیا ھے ۔ اکبر نجیب‌آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ھیں : خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ھندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا، یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ھوا ۔(۴)

یہاں یہ بات قابل ذکر ھے کہ اقبال بر صغیر کے بعض ممتاز علماء کے علم و فضل کے نہ صرف معترف تھے بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا تھا، مثلاً دیوبند کے معروف عالم مولانا انور شاہ کاشمیری کے بارے میں اقبال نے کہا تھا :- میں تو مولانا انورشاہ صاحب کا رسالہ (حدوث العالم) پڑھ کر دنگ رہ گیا ھوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ھے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ھے،

۱- مقالات افغانی ، حیدر آباد ، ۱۹۴۴ ، ص ۴۴-۴۵ (مرتبہ سید مبارز الدین رفعت)

۲- ایضاً ، ص ۴۱

۳- اقبال نامہ ، لاھور ، ۱۹۰۱ ، ج ۲ ص ۶۴ (مرتبہ شیخ عطاء اللہ)

۴- انوار اقبال ، لاھور ، ۱۹۷۷ ، ص ۲۱۷ (مرتبہ بشیر احمد ڈار)

حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔(۵) اقبال نے اپنے معروف انگریزی لیکچر کی تیاری میں علماء سے نہ صرف مدد لی، بلکہ اردو میں ان لیکچرز کے ترجمہ کے وقت، سید نذیر نیازی سے کہا کہ وہ علماء سے رجوع کریں، چنانچہ نیازی صاحب نے مولانا محمد سورتی اور اسلم جیراج پوری سے رجوع بھی کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اقبال نے سیاست میں علماء کی آمد پر اپنی تشویش کا کیوں اظہار کیا؟ علماء سے اقبال کے تعلقات اور برصغیر کی سیاسی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کلاسیکی روایات میں تو علماء کی بصیرت کے قائل تھے، لیکن عہد نو کے تقاضوں سے ان کی بے اعتنائی کی بنا پر سیاست میں ان کی آمد کو نقصان دہ سمجھتے تھے۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اقبال نے یہ خط بر صغیر میں تحریک خلافت کے زمانے میں لکھا تھا۔ تحریک خلافت میں علماء نے بنیادی رول ادا کیا، لیکن بعض فیصلے ایسے بھی کئے گئے تھے جن میں عقل و منطق سے زیادہ تند و تلخ جذبات نے اہم رول ادا کیا تھا۔ مثلاً علماء نے یہ فتوی دیا کہ ہندوستانی مسلمان یہاں سے ہجرت کر جائیں، اس فتوی کی بنا پر هزاروں مسلمان اپنے گھربار چھوڑ کر پنجاب اور دوسرے علاقوں سے افغانستان چلے گئے اور پنجاب کی سرزمین ظفر علی خاں کے نعرہ "قندھار چلو، قندھار چلو"، سے گونج اٹھی۔ لیکن یہ مسلمان افغانستان سے جس مایوسی کے ساتھ واپس اپنے گھروں کو آئے، وہ ہماری تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالکلام آزاد کو جو عبدالباری فرنگی محل اور علی برادران کے ساتھ تحریک میں پیش پیش تھے، خود اپنی اس اجتہادی غلطی کا احساس تھا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ آزاد کی رائے میں برصغیر سے مسلمانوں کی ہجرت انگریزی سازش کا نتیجہ تھی۔(۶) خلافت کے بارے میں

۵- 'حیات انور'، دهلی، ۱۹۰۰، ص ۱۶۳ (مرتبہ ازهر شاہ قیصر)

۶- 'اوراق گم گشتہ'، از محمد علی جوهر، مرتبہ رئیس احمد جعفری، عزیز هندی نے دعویٰ کیا ہے کہ هندوستان سے ہجرت کا تصور انہوں نے دیا ہے۔

علماء کی اکثریت نے جو موقف اختیار کیا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ علماء نہ تو خلافت عثمانیہ کی سیاسی، اجتماعی اور فوجی زندگی سے آگاہ ہیں، اور نہ ہی ترکوں اور عربوں کے سیاسی اختلافات سے آشنا، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی تعلیمی اور فکری تربیت درس نظامی نے کی تھی۔ جس میں تاریخ، جدید رجحانات اور عہد حاضر کی فکری اور سیاسی تحریکات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ظاہر ہے عہد جدید کی تاریخ کو پڑھے بغیر عہد حاضر کی سیاست میں آنا قومی نقطۂ نظر سے سود مند نہیں، شاید اسی وجہ سے اقبال نے میدان سیاست میں علماء کی آمد کو خطرناک قرار دیا تھا، یہاں پر بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ علماء کے برعکس محمد علی جوہر تو جدید تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے مولانا عبدالباری کی قیادت میں جو رول ادا کیا، کیا اس پر بھی فرمودۂ اقبال صادق آتا ہے ؟

یہاں پر اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی تاریخ میں علماء نے کبھی سیاسی اقتدار حاصل نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس کی خواہش کی، ریاست کے مختلف شعبوں میں ایک اہم شعبہ قانون اور مذہبی تعلیم کا بھی ہے، چنانچہ اس میدان میں جن لوگوں نے قرآن اور سنت رسولؐ کا علم حاصل کیا، انہوں نے خلیفہ یا سلطان کے سیاسی اقتدار کے اندر رہ کر قانون داں، قاضی اور فقہاء کی حیثیت سے ریاست کی خدمات سر انجام دیں، اور سوسائٹی کی اجتماعی روح کی نشوونما کے لئے ان روحانی قدروں کو ضروری قرار دیا جن کی بنیاد مذہب پر ہے ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ علماء اور خاص طور پر صوفیا نے ہمیشہ سیاسی اقتدار سے الگ رہنے کو بہتر قرار دیا اور اس طریق کو عوام میں صحت مند روحانی اور مذہبی اقدار کی ترویج کے لئے زیادہ موثر خیال کیا۔ یہ شاید برطانوی ہندوستان میں پہلا موقعہ تھا کہ مسلم سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد حالات نے علماء کو ان کی خانقاہوں اور مدارس سے نکال

کر عملی سیاست میں لا کھڑا کیا تھا۔ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے مذھبی اصلاح کے ساتھ ساتھ، مذھبی آزادی کے حصول کے لئے میدان کارزار میں اتر کر علماء کے سامنے ایک نئی مثال قائم کردی تھی۔ ۱۸۳۲ء کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ میں علماء نے مقدور بھر حصہ لیا۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی شاید مولانا محمود الحسن دیوبندی تھے۔ جنھیں پہلی جنگ عظیم کے وقت برطانوی حکومت نے اس الزام میں گرفتار کیا تھا کہ انھوں نے "شاہ معظم کے خلاف سازش کی ھے"۔ مولانا موصوف نے ۱۹۱۶ء میں اپنے عارضی قیام مکہ میں عثمانی حکومت کے چند ممتاز رھنماؤں، انور پاشا، جمال پاشا، وغیرہ سے مل کر یہ طے کیا تھا کہ ھندوستان پر ترک حملے کی صورت میں ھندوستانی مسلمان برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ھوں گے۔ چنانچہ مولانا نے ترک رھنماؤں سے چند خطوط بھی حاصل کئے، جنھیں وہ سرحد کے آزاد علاقہ یاغستان میں بھجوانے میں کامیاب ھوگئے۔ لیکن خود ھندوستان واپس نہ آسکے، بلکہ حجاز ھی میں گرفتار کر لئے گئے۔ مالٹا میں چند سال اسیر رھنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں ھندوستان آئے۔(۷) اسی سال نومبر میں جمعیت علماء ھند نے اپنا سالانہ اجلاس دھلی میں بلایا، جس کی صدارت مولانا موصوف نے کی، اس صدارتی تقریر سے پتہ چلتا ھے کہ مولانا کے غیر ملکی قیام نے ان کے سامنے ملکی سیاست کے خد و خال کو واضح کردیا ھے، علماء کو خطاب کرتے ھوئے انھوں نے کہا کہ "اسلام صرف عبادت کا نام نہیں ھے، بلکہ وہ تمام مذھبی، تمدنی، اخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ھے، جو لوگ زمانہ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کرتے ھیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رھنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لئے کافی سمجھتے ھیں، وہ اسلام کے پاک و صاف دامن

۷۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ھو ' نقش حیات، از مولانا حسین احمد مدنی ، دیوبند، ۱۹۵۴ء ، ج ۲ ص ۱۶۱ - ۲۵۸ -

پر ایک دھبہ لگاتے ھیں،، ۔

مولانا موصوف کو ان کی دینی حمیت، ایثار، علم اور سامراج دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں کے دونوں گروھوں نے اپنا رھنما تسلیم کر لیا ۔ وہ علی گڑھ اور دیوبند کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لئے علی گڑھ بھی تشریف لے گئے تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ اور علماء کی باھمی سیاسی رقابت ختم ھو، عبیداللہ سندھی کے بقول علماء کو اس بات کا احساس تھا کہ سیاسی قیادت کا مرکز ثقل علماء سے منتقل ھوکر جدید تعلیم یافتہ گروہ کی طرف منتقل ھورھا ھے۔ مولانا موصوف اسی سال فوت ھوگئے اور ان کی سیاسی بصیرت اور پختہ فکر سے جس کا ظہور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں ھوا (۸) ۔ علماء کو استفادے کا موقعہ نہ ملا، آزاد ھندوستان میں حکومت کا سیاسی ڈھانچہ کیا ھوگا؟ عہد حاضر میں جمہوریت کے نام پر کیا کچھ کیا جا رھا ھے اور یہاں جمہوری نظام کیوں کر بروئے کار آئے گا؟ ان امور کے بارے میں علماء کی کیا رائے تھی؟ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ھے کہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں بدایوں میں جمعیت علماء کی ذیلی کمیٹی نے اپنی سفارشات مرتب کرتے ھوئے کہا کہ آزاد ھندوستان میں مسلمانوں کا ایک امیر الہند ھوگا، جس کا تقرر اور عزل ترکی کا خلیفہؑ وقت ھندوستان کی جمعیت علماء سے مشورہ کرکے کرے گا ۔ امیرالہند کو تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور ھونا چاھئے ۔(۹) میرا خیال ھے کہ یہ سفارشات اقبال کی نگاہ سے ضرور گزری ھوں گی ۔ ان واقعات کی روشنی میں اس رائے سے شاید ھی اختلاف کیا جاسکے کہ ''مذھبی طبقے کے سیاسی جذبات اپنی تمام شدت کے باوجود مبہم تھے، ان کو واضح شکل اور معین سمت مولانا ابوالکلام

۸- 'جامعہ کے پچیس سال از ذاکر حسین، دھلی، ۱۹۴۶ء ذاکر صاحب نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ھوئے کہا: وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا،،۔

۹- جمعیت علماء ھند کیا ہے؟ از محمد میاں، دھلی ۱۹۴۶ء ، ج ۲، ص ۸۴، بحوالہ پیٹر ، ھارڈی The Political Thought of some Muslim Scholars سویڈن ۱۹۷۱ء

آزاد نے دی،،(۱۰) لیکن جب یہ 'واضح شکل، یا 'معین سمت، علماء کے سامنے نمودار ہوئی تو وہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے حق میں سیاسی قیادت سے دست بردار ہوگئے ۔ چنانچہ جمعیت علماء ھند نے کانگریس کی سیاسی قیادت کو قبول کر لیا اور جمعیت علماء اسلام نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں مسلم لیگ کی سیاسی رہنمائی کو تسلیم کر لیا ۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے کھل کر اس امر کا اعتراف کیا کہ موجودہ وقت میں ھمیں مسلم لیگ کو کامیاب بنانا چاھئے، آپ نے ۱۹۳۸ء میں خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون کے ناظم مولانا شبیر علی کو بلا کر کہا ۔

''میاں شبیر علی! ھوا کا رخ بتا رھا ھے کہ لیگ والے کامیاب ھوجائیں گے. بھائی ! آج کل کے حالات ایسے ھیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں، یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ھمارے بس کا کام نہیں، . . . اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانت‌دار بن گئے اور پھر سلطنت ان ھی کے ھاتھ میں رھی تو چشم ما روشن ،دل ما شاد ،،(۱۱)

علماء کے بارے میں اقبال کا یہی تاثر تھا ، جس کی بناء پر انھوں نے سیاست میں ان کی آمد کو پسند نہیں کیا، ورنہ بنیادی طور پر علماء سے کوئی اختلاف نہیں تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ھوگا کہ اقبال اور علماء دونوں ایک ھی مسلک سے تعلق رکھتے ھیں ۔ اقبال نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا : ''میں سلف کا پیرو ھوں، نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ھوں اور عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ھوں ،،(۱۲)

۱۰- قومی تہذیب کا مسئلہ ، علی گڑھ ، ص ۲۰۰-

۱۱- سیرت اشرف ، از منشی عبدالرحمان، ملتان، ۱۹۵۹، ص ۵۵۹ -

۱۲- روزگار فقیر از فقیر وحید الدین، کراچی ۱۹۶۵ ج ۲ ، ص ۶۱

یہاں پر اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ عبدہ نے الغالی کے مسلک کے بارے میں لکھا ہے :

''وہ حنفی تھے، لیکن عقیدے میں غیر مقلد، سنت صحیحہ کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا، صوفیاء کرام کے مسلک سے لگاؤ تھا،، ۔(۱۳)

اقبال کے فکر انگیز اور مجتہدانہ خیالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا ممکن ہوگا کہ اقبال بنیادی طور پر علماء کے خلاف نہیں تھے ۔ البتہ عصر حاضر کے فکری مسائل، روحانی بحران اور جدید علوم کے بارے میں علماء کے موقف کو مسلمانوں کی فکری زندگی کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے ۔ وہ علماء کو جن کے اسلاف کی فکری کاوشوں کو انھوں نے سراہا ، اس صدی میں صحیح معنی میں دانشں مند دیکھنا چاہتے تھے اور یہ بات تبھی ممکن ہے کہ علماء مغربی فلسفہ و تمدن سے اجتناب کی بجائے آشنائی بہم پہنچائیں ۔ کیونکہ اقبال کی رائے میں مشرق کی نوجوان مسلم نسل اپنے اعتقاد کی نئی تعبیر کا مطالبہ کر رہی ہے ۔ جس کی وجہ سے عہد حاضر کے مسلمان کی ذمہ داری بے حد بڑھ گئی ہے ۔ چنانچہ اسلام کے پورے نظام پر از سر نو اس انداز سے غور ہونا چاہئے، کہ اس کا رشتہ ماضی سے منقطع نہ ہو۔(۱۴)

اقبال نے روایات اور سائنسی مشاهدات کے باهمی ربط پر جو زور دیا ہے، اس کی وجہ وہ سائنسی انکشافات ہیں ، جن سے مرعوب ہوکر انسان اپنی روایات کو چھوڑ رہا ہے ۔ اس امر کا ذکر کرتے ہوئے مغرب کے معروف صوفی منش فلسفی شون (**Schuon**) نے کہا ہے کہ جدید دماغ کا المیہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت روایات کے رمزی اظہار اور سائنس کے مادی مشاہدات

۱۳- تاریخ الاستاذ الامام، از رشید رضا، قاہرہ، ۱۹۳۱، ج ۱ ص ۳۳ -

۱۴- مذهبی فکر کی تشکیل جدید، (چوتھا خطبہ)۔

کی باہمی ہم آہنگی کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔(۱۵)

بہر نوع کلاسیکی روایات اور جدیدیت میں رشتہ قائم کرنا، وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ اور یہ کام وہی شخص کر سکتا تھا جسے نہ صرف روایات اور جدید فکر سے آشنائی ہو، بلکہ وہ روایات کی روحانی تشریح و تعبیر کے لئے وجدان بھی رکھتا ہو۔ فطرت نے یہ کام اقبال سے لیا۔ روایات کی اقبال نے جو حسین رمزی تشریح کی ہے، اس کی ایک مثال سنئے: قرآن مجید نے ہبوط آدم کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ آدم کی ایک لغزش زمین پر آمد کا باعث بنی، اقبال نے اس قصہ کی تشریح میں کہا کہ ہبوط آدم دراصل ایک اشارہ یا علامت ہے کہ انسان کس طرح اپنی فطری خواہشات سے بلند ہو کر اپنی تخلیقی انا کا شعور حاصل کرتا ہے اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں کیونکر بیدار ہوجاتی ہیں۔(۱۶)

یہی وہ نقطہ ہے جہاں پر علماء، اقبال سے الگ ہوجاتے ہیں۔ علماء نے اپنی توجہ ماضی کے ورثے کی حفاظت پر مرکوز رکھی، دارالعلوم دیوبند اور اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کا رول ہمارے سامنے ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مولانا قاسم نے جدید علوم کی مخالفت نہیں کی، انھوں نے دارالعلوم کی ایک سالانہ تقریب میں کہا کہ موجودہ عہد میں نئی تعلیم کے جو انتظامات کئے گئے ہیں وہ پرانی تعلیم کو میسر نہیں، اس لئے ہمیں قدیم ورثے کی حفاظت کرنا ہے۔ البتہ یہاں سے فراغت کے بعد طلبہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کی یہ دوسری خواہش ان کے جانشین پوری نہ

۱۵۔ زبان ذات ، مدراس ۱۹۵۹ ، ص ۲۲۰ - ۲۲۱ (Language of the Self)
شون صاحب فرماتے ہیں:-

The tragic dilemma of the modern mind results from the fact that the majority of men are not capable of grasping a priori the compatibility of the symbolic expressions of tradition with the material observaltions of science.

۱۶ تشکیل جدید، (چوتھا خطبہ)۔

کرسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم ورثے کی حفاظت ایک تاریخی کام ہے جو علماء نے سر انجام دیا، جس کی اقبال بھی عزت کرتے ہیں، کیونکہ وہ روایات سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں بلکہ ان کے تاریخی تسلسل کو برقرار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ تاریخی تسلسل ٹوٹ گیا ہوتا اور کلاسیکی روایات کی حفاظت نہ کی گئی ہوتی، تو بے شبہ آج اسلام ہمارے سامنے اس شکل میں نہ ہوتا جس سے انسانی تاریخ آشنا ہے اور جس کی رگوں میں ملت اسلامیہ کے ہزاروں بہترین دماغوں کا خون صدیوں سے گردش کر رہا ہے۔ لیکن روایات کی حفاظت و دفاع ہی زندگی کے مسائل کا حل نہیں، زندگی کے تقاضے اور بھی ہیں، اور وہ وہی ہیں، جن کی خبر اقبال نے اپنی پیغمبرانہ شاعری اور الہامی خطبات میں دی۔ اقبال نے یہ جو بار بار علماء کو ان کی معنوی بیماریوں — جمود تنگ نظری، بے کیف رسوم پرستی، حقائق حیات سے تغافل — کی طرف توجہ دلائی ہے، اس سے ان کا مقصد علماء کو خود ان کے اپنے صحیح مقام سے آگاہ کرنا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عہد حاضر میں اس تاریخی مشن کو جس کی ابتداء خود انھوں نے کی، آگے بڑھانے میں علماء بہتر طور پر کام کر سکتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ وہ علی گڑھ تحریک سے جو مرحوم سر سید کی راہ سے ہٹ کر انگریزی طرز معاشرت کی بھونڈی نقالی کا نشان بن کر رہ گئی تھی، مایوس ہوچکے تھے۔ اقبال نے اپنی اس مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا :۔
''گزشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے بے حد افسردہ کر دیا ہے، مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔''

علماء پر اقبال کی تنقید کا یہ وہ پس منظر ہے، جو ہمارے اکثر دوستوں کی نگاہ سے شاید اوجھل ہے۔ چنانچہ اگر علماء کے نصاب تعلیم کا رشتہ عہد حاضر سے جوڑ دیا جائے تو پھر اقبال کا علماء سے کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ فلسفہ سے اقبال کی

گہری دلچسپی علماء کے ہاں معیوب قرار نہیں پائی۔ افغانی نہ صرف فلسفہ کے شیدائی تھے بلکہ اس بات کا شکوہ بھی کرتے تھے کہ مسلمانوں نے فلسفہ سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے اور یہ امر مسلمانوں کے علمی زوال کا باعث بنا ہے۔ غرضیکہ نصاب تعلیم کا مسئلہ اقبال کے ہاں اہم مسئلہ تھا۔ اس لئے انہوں نے جب عہد حاضر میں مسلم ریاستوں میں اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے علماء کو اسمبلی میں جانے کا مشورہ دیا، تو کہا کہ موجودہ فقہی تعلیم میں اہم تبدیلیاں کی جائیں اور جدید فلسفہ قانون بھی پڑھایا جائے۔(۱۷) یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال نے ایران کی طرز پر مسلم ممالک میں علماء بورڈ کے قیام کو ناپسند کیا ہے اور اس تجربہ کو خالی از خطرہ قرار نہیں دیا۔ اقبال کے اس اندیشہ پر ہمارے سکالرز کو توجہ دینی چاہئے۔ ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا ہوگا کہ کیا ایک مسلم ریاست میں وزارت برائے امور مذہبی کا تصور اقبالی تصور کے مطابق ہے ؟ ایک اسلامی ریاست میں امور مذہبی کا الگ شعبہ کیا ہمارے نظام فکر کی ثنویت کی خبر نہیں دے رہا ؟ یہاں ہم علماء سے بھی اپیل کریں گے کہ وہ نہ صرف نصاب تعلیم کو عہد جدید کے تقاضوں سے روشناس کرائیں، بلکہ اس میں خود اقبال کے لیکچرز، جن کا عربی ترجمہ قاہرہ سے شائع ہوچکا ہے، جاوید نامہ اور بال جبریل کو خاص طور پر شامل کریں۔

قیام پاکستان کے بعد علماء نے ۱۹۲۲ء کے بعد پہلی بار جدید تعلیم یافتہ گروہ کی سیاسی قیادت کو چیلنج کیا، جس پر اہل سیاست کا برہم ہونا ایک فطری بات تھی، انہوں اپنے اقتدار کی حمایت میں بعض اہل قلم کا سہارا لیا۔ چنانچہ بعض پاکستانی سکالرز نے اقبال کے حوالہ سے علماء پر سخت تنقید کی۔ اس کی ابتداء شاید مرحوم خلیفہ عبدالحکیم نے کی، آپ نے ۱۹۵۳ء میں "اقبال اور ملا" کے نام سے ایک مقالے میں برصغیر کے ممتاز علماء پر ذاتی حملے

۱۷۔ ایضاً (۶ لیکچر)

گئے ۔(۱۸) خلیفہ صاحب نے علما' کے افکار کا سنجیدگی اور متانت سے محاسبہ کرنے کی بجائے پروپیگنڈے کی راہ اختیار کی ۔ جس سے فن تنقید میں صحت سند روایات کا آغاز نہ ہو سکا ۔ پاکستان میں علما' کا سیاسی رول ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ البتہ اس ''حسن اتفاق،، کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ تحریک خلافت میں ہندوستان سے ہجرت سے متعلق فتویٰ کا پہلے ذکر آچکا ہے، اس سے مماثل ایک دوسری رائے کا اظہار ۱۹۵۳ء میں کیا گیا ۔ منیر رپورٹ نے لکھا ہے کہ اگر ہندوستان دارالحرب بن جائے یا ہند و پاک جنگ چھڑ جائے، ایسی صورت میں بعض علما' نے عدالت کو بتایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان آجانا چاہئے ۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں علما' نے یہ بھی کہا کہ شرعی عدالتوں کی نگرانی کے لئے ''شیخ الاسلام،، کے منصب کا قیام ضروری ہے ۔ اس قسم کے سیاسی افکار سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی اور فلسفہ اسلام کے بارے میں اقبال نے جس صحت سند اور متحرک نقطہ' نظر کا تفصیل سے تذکرہ اپنے چھٹے خطبہ میں کیا ہے، اس سے ہمارے علما' آشنا نہیں، اگر انھوں نے عہد حاضر کی سیاسی زندگی اور اسلام کے فلسفہ قانون و سیاست کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو پھر وہ بھی یقیناً انہیں نتائج پر پہنچتے جن کی خبر اقبال نے دی ہے اور وہ فتوے دیکھنے میں نہ آتے جن کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ مشکلات سے ہے ، بہر نوع پاکستان میں علما' کے سیاسی اور مذہبی رول کا تحقیقی جائزہ لیا جانا چاہئے، لیکن تنقید و تحقیق کی مسلمہ روایات کا احترام کرتے ہوئے ۔

علما' پر تنقید کے ساتھ ساتھ اقبال کے حوالہ سے عقل و دانش اور مغربی تہذیب، جسے اقبال مسلم ثقافت کے فکری پہلو کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں، کے خلاف بھی سطحی پروپیگنڈہ کیا گیا ۔ جس نے ہماری فکری اور اجتماعی زندگی میں تعطل، انتشار اور نفرت کو جنم دیا ۔ عقل کی بالا دستی کو بحال

۱۸- مقالات حکیم، لاہور ۱۹۶۹، ج ۲ ص ۱۸۲ (ط ۔ ثقافت اسلامیہ)

کرنے کے لئے سر سید نے جو تاریخی تحریک چلائی تھی، اور جسے اقبال کے وجدان نے توانائی بخشی تھی، اسے ہمارے دوستوں نے عقل و وجدان کی بحثوں سے سخت نقصان پہنچایا، جس کے نتیجہ میں ہم ادب، فلسفہ مذہب اور سیاست میں کوئی تخلیقی کام نہ کرسکے۔ اور خود اپنا محاسبہ بھی نہ کر سکے کہ ہمارا معاشرہ، سیاست، تعلیم اور اخلاق میں کس حد تک اقبالی تصورات کی طرف بڑھا ہے ؟ یا اگر ہم فلسفہ اقبال کی بنیادوں پر اپنے معاشرے کو استوار نہیں کر پائے تو کیوں ؟ اور اب ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟ مزید یہ کہ جن لوگوں نے خالص علمی سطح پر اقبال کے افکار پر ناقدانہ نگہ ڈالی ہے مثلاً آر، گب (R. GIBB)، جمیل خواجہ اور سچیدانند سورتی، ان کے افکار کا بھی جائزہ لیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم خلوص اور سنجیدگی سے فکر اقبال کی روشنی میں علماء اور دانشوروں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ موجودہ وقت میں یہی ایک راہ ہے جس پر چل کر ہم پاکستانی روح کے بحران پر قابو پا سکتے ہیں۔